خطبہ ثالث 3

عہد حاضر میں نظام خلافت کا معاشی و معاشرتی ڈھانچہ

ذیلی عنوانات

- مارکسزم کے رہنما اصول اور اسلام
- نظام سرمایہ داری کے بنیادی اصول اور اسلام
- سرمایہ داری نظام کو اسلامی نظام میں کیسے بدلا جا سکتا ہے؟
- اسلامی نظامِ معیشت
- اسلامی اصولوں پر عمل کی صورتیں
- زمین کا مسئلہ
- قمار یا جوا
- دورِ ملوکیت کے مفاسد
- فقہ پر ملوکیت کے اثرات
- بیع موجل اور بیع مرابحہ
- دور ملوکیت کے باقیات سیئات
- زکوٰۃ کی حقیقت
- اسلام کا معاشرتی نظام
- معاشرتی نظام کے اصول و مبادی

اس حد درجہ اہم موضوع پر گفتگو سے پہلے چند تمہیدی باتیں واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس عہد میں آج سے پہلے جب کبھی اقتصادیات کے موضوع پر بات ہوتی تھی تو سوشلزم یا کمیونزم کے اقتصادی نظام اور مغربی سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کے مابین ایک تقابل ہمارے سامنے آتا تھا، کیونکہ دنیا میں بالفعل یہی دو نظام موجود تھے۔ جہاں تک تعلق ہے اسلام کا، وہ ذہنوں اور کتابوں میں تو موجود ہے مگر بالفعل کسی خطۂ زمین پر اس کا وجود نہیں ہے۔ گویا وہی بات کہ

مسلمانی در کتاب و مسلماناں در گور

(اسلام کا وجود ''کتاب'' میں ہے اور مسلمان قبر میں)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اس دنیا کے دو اقتصادی نظاموں میں سے ایک کی تو گویا موت واقع ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کا حریف مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اس وقت بڑے سرور اور نشے کی کیفیت میں ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کی ناکامی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا نظام صحیح ہے۔ مغرب میں اپنی اس فتح پر جشن منایا جا رہا ہے۔

اصولاً یہ بات عرض کر دوں کہ کمیونزم کا اقتصادی نظام اگرچہ ایک غیر فطری انتہا پسندی کو چھونے لگا تھا، لیکن اصلاً وہ مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کا فطری و منطقی ردعمل تھا۔ اس وقت دنیا میں پھر وہی مغربی سرمایہ دارانہ نظام چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ اگر اسلام کا عادلانہ اقتصادی نظام دنیا میں نافذ نہ ہوا تو ردعمل دوبارہ کسی اور شدید تر شکل میں ظاہر ہو جائے گا۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں یقیناً کوئی فساد تھا کہ ردعمل کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔

مارکسزم کے رہنما اصول اور اسلام

اسلام نے مارکسزم (کمیونزم) کے چار رہنما اصولوں (Cardinal Principles) کو اپنے ہاں روحانی اور اخلاقی سطح پر برقرار رکھا ہے، قانونی سطح پر نہیں۔ ان میں سے پہلا اصول، انسانی ملکیت کی نفی ہے، ہر شے اللہ کی ملکیت ہے، نہ کسی انسان کی انفرادی ملکیت ہے نہ ہی قومی ملکیت ہے۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ایک سے زائد مرتبہ وارد ہوئے ہیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (البقرہ: ۲۸۴) (اللہ ہی کی ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے)۔

انسان کے پاس جو کچھ ہے امانت ہے۔ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ محض انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اور فضل اسے کہا جاتا ہے جو کسی استحقاق کے بغیر عطا ہو۔ جبکہ اجرت اور اجر استحقاق کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ بندۂ مومن کو یہ کبھی نہ سمجھنا چاہئے کہ اسے جو کچھ ملا ہے یہ سب کچھ اس کی کمائی اور محنت سے میسر آ گیا ہے، نہ ہی اسے اپنی صلاحیت اور ذہانت کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (جمعہ: ۱۰)

یعنی ''جب نماز (جمعہ) مکمل ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔''

چنانچہ اس فضل میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ضروریات ہیں اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے ہمیں عطا کر دیا ہے۔ امتحان یہ ہے کہ اس زائد مال کو فقراء اور مساکین میں تقسیم کر کے ''حق بحق دار رسید'' (حق حقدار کو پہنچ گیا) پر عمل کرتے ہو یا اس پر غاصبانہ قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہو کہ میرا مال ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرہ: ۲۱۹)

یعنی ''اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں۔ کہہ دیجئے، ضرورت سے جتنا زائد ہے (العفو) اس کا انفاق کرو (بھلائی کے کاموں میں خرچ کرو)۔''

آپ غور کیجئے اس سے بھی اونچا کوئی سوشلزم ممکن ہے۔ لیکن یہ ہے رضاکارانہ، اختیاری۔ اس کو قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق زندگی گزاری ہے، آپؐ نے پوری زندگی کچھ بچا کر رکھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ کا سوال پیدا ہو۔ میں جب یہ کہا کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی زکوٰۃ دی ہی نہیں تو اس پر لوگ چونک جاتے ہیں۔ زکوٰۃ دینے کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب آپ کچھ بچا کر رکھتے اور صاحب نصاب ہوتے۔ اس کو میں Spiritual Socialism سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔

جس روحانی سوشلزم کا ذکر ابھی ہوا ہے اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بہت سے فقراء صحابہؓ نے بھی زندگی گزاری ہے۔ انہی فقراء صحابہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ شدت زہد کی وجہ سے کسی قدر انتہا پسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ سونے کا ایک ٹکڑا بھی اپنے پاس رکھنا حرام مطلق ہے۔ پھر یہ معاملہ صرف صحابہؓ تک بھی محدود نہیں، بلکہ ہمارے صوفیائے عظام نے بھی اسی روحانی سطح پر زندگی بسر کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام انہی صاحب کردار لوگوں کی وجہ سے پھیلا۔ جب کہ ہمارے ہاں جو بادشاہ آئے وہ اسلام کی طرف دعوت دینے کے بجائے اسلام سے متنفر کرنے والے تھے۔

نظام سرمایہ داری کے بنیادی اصول اور اسلام

مندرجہ بالا اصولوں کے برعکس میں آپ کو تین ایسے اصول بتانا چاہتا ہوں جن کی بنیاد پر آج مغربیت فتح مند ہے اور یہ اصول اسلام میں بھی موجود ہیں۔

ا۔ پہلا اصول: قانونی سطح پر نجی ملکیت (Private ownership) کا ہے۔ اس کے تحت آپ کسی بھی چیز کے قانوناً مالک ہو سکتے ہیں۔ ہر استعمال کی شے کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ذرائع پیداوار (Means of production) کی بھی نجی ملکیت (Private ownership) ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ دوکان، کھیت اور کارخانے کے مالک ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کا اصل الاصول ہی نجی ملکیت کا تصور ہے۔ اس تصور کا منطقی نتیجہ ذاتی ترغیب (Personal Insentive) کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ آپ زیادہ محنت کریں گے، راتوں کو جاگیں گے، اپنی ذاتی جائیداد میں اضافہ کریں گے تو تمام پیداواری اضافہ آپ کا اپنا ہوگا۔ کیمونزم کی موت واقع اسی لیے تو ہوئی ہے کہ وہاں یہ ذاتی ترغیب (Personal Insentive) کا عنصر مفقود تھا۔ ہر شخص فطری طور پر سوچتا ہے کہ میں زیادہ کام کیوں کروں جب کہ مجھے معلوم ہے...... کہ مجھے ایک معین مشاہرہ ہی ملنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جو صنعتیں قومیائی گئیں ان کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کارخانہ دار تو راتوں کو جاگے گا۔ اسے معلوم ہے کہ کارخانے کا خراب پرزہ اگر راتوں رات نہ بن گیا تو میرا کارخانہ کل بند رہے گا، جس سے مجھے اتنے لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر جنرل منیجر صاحب صرف ایک تنخواہ دار آدمی ہیں تو اس کا اپنا کوئی ذاتی مفاد تو اس میں ہے نہیں، وہ کس لیے محنت کرے۔ کارخانہ خراب ہوتا ہے تو ہو، کام بند ہوتا ہے تو ہو جائے۔

۲۔ دوسرا اصول: دوسری چیز Market Economy ہے، جو رسد و طلب Suply and Demand کے اصول پر مبنی ہے۔ اس اصول کے تحت چیزوں کی رسد اگر زیادہ ہے اور طلب کم ہے تو قیمتیں گر جائیں گی۔ اس کے برعکس اگر رسد کم ہے اور طلب زیادہ ہے تو قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی Artificial Control کی ضرورت نہیں، اور اگر آپ مصنوعی طور پر کنٹرول کریں گے تو لوگوں کو بے ایمان بنانے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

۳۔ تیسرا اصول: مغربی سرمایہ دارانہ معیشت کا تیسرا اصول Hire and Fire ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو اپنے ہاں ملازم رکھتے ہیں۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اسے احسن انداز میں انجام دے گا۔ آپ یہ بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کی Out Put کیا ہوگی۔ اسی بنیاد پر آپ اس سے تنخواہ کا معاملہ بھی طے کر لیتے ہیں۔ یہ سارا عمل Hire ہے۔ لیکن آپ کچھ عرصے بعد محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس صلاحیت کا مالک نہیں یا وہ محنت نہیں کرتا تو اسے ملازمت سے برخواست کر دیتے ہیں۔ یہ Fire کا عمل ہوا۔ اور آپ جس طرح Hire کرنے کے مجاز تھے، اسی طرح اپنے مفاد کے مدنظر Fire کرنے کے مجاز بھی ہیں۔

سرمایہ داری نظام کو اسلامی نظام میں کیسے بدلا جا سکتا ہے

یہ تینوں اصول اسلام میں بھی موجود ہیں، مگر جس طرح نظام خلافت کے سیاسی اور دستوری نظام پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ کسی بھی جمہوری نظام میں تین چیزیں شامل کر دی جائیں تو وہ نظام خلافت میں تبدیل ہو جائے گا۔ یعنی اللہ کی حاکمیت، کتاب وسنت کی کامل بالادستی اور مسلم قومیت کا تصور۔ بالکل اسی طرح مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے تین چیزیں نکال دیجئے تو وہ اسلامی نظام معیشت میں ڈھل جائے گا۔

ا۔ پہلی چیز جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام سے نکالنی ہے وہ ربا ہے۔ یہ ہے تو ایک چیز لیکن بہت ہی بھاری ہے۔ یہ ربا نظام معیشت میں بری طرح پیوست ہو چکا ہے۔ آپ یوں سمجھئے کہ کینسر ہے جو پورے جسم میں سرایت کر چکا ہے۔ آپ کہاں کہاں سے آپریشن کریں گے۔ گویا ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(پورا جسم زخموں سے چور چور ہے (مرہم کا) پھاہا کہاں کہاں رکھوں)

بالکل اسی طرح یہ ربا ہماری معیشت کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے، جو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے بغیر نہیں نکل سکتا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے اس عمل ہی کا نام انقلاب ہے۔

۲۔ دوسری چیز جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے نکالنی ہے وہ جوا ہے۔

۳۔ تیسری چیز جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کو نکال دیجئے۔

بظاہر یہ تین چیزیں بہت چھوٹی چھوٹی لگتی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظام کو مکمل طور پر بدلے بغیر ان کو نکالنا ممکن نہیں ہے۔

اسلامی نظام معیشت

اسلام کے نظام معیشت کے حوالے سے میں چند بنیادی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام یہ تو چاہتا ہے کہ سرمایہ کاری ہو مگر وہ سرمایہ داری کو باقی رکھنے کا روادار نہیں۔ مغربی معیشت سرمایہ کاری پر مبنی ہے۔ لیکن جب اس میں سود شامل ہو جاتا ہے تو سرمایہ کاری، سرمایہ داری بن جاتی ہے۔ سرمایہ کاری تو یہ ہے کہ آ ؤ کام کرو۔ سرمایہ لگاؤ اور تجارت کرو، لیکن تم کو سرمایہ داری کی اجازت نہیں ہے۔ سرمایہ داری یہ ہے کہ محض سرمایہ کو نفع اندوزی کا ذریعہ بنایا جائے۔ محنت بھی نہ کی جائے اور نقصان میں شرکت بھی نہ کی جائے۔ اس کا نتیجہ دولت کے ارتکاز کی صورت میں نکلتا ہے، جس کے بارے میں قرآن حکیم نے کہا ہے کہ:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر: ۷)

یعنی ''ایسا نہ ہونا چاہئے کہ سرمایہ صرف دولت مندوں ہی کے درمیان گردش کرتا ہے۔''

کیونکہ اس طرح طبقاتی تقسیم پیدا ہو جائے گی اور قرآن مجید کی اصطلاح میں ''مترفین'' اور ''محرومین'' کے دو طبقے وجود میں آ جائیں گے۔

مترفین کا طبقہ اس طرح وجود میں آتا ہے کہ ہر معاشی Proposition میں تین امور شامل ہوتے ہیں۔

(الف) سرمایہ، (ب) محنت، (ج) اور موقع۔ کیونکہ وہی سرمایہ کاری اور وہی محنت کسی خاص وقت یا جگہ پر زیادہ نتیجہ خیز اور منافع بخش ثابت ہوتے ہیں۔ جب کہ وہی سرمایہ اور وہی محنت کسی دوسرے وقت اور جگہ پر اس قدر نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوتے۔ اسی کو موقع یا Chance کہتے ہیں۔

اسلام نے اصلاً زور محنت پر دیا ہے۔ گویا محنت کو تحفظ حاصل ہے جبکہ...... سرمایہ کو محض سرمایہ کی حیثیت سے Earning Factor بنا دیا جائے تو اسلام کی نظر میں یہ غلط ہے۔ اسی طرح Chance محض Chance کی حیثیت سے اگر کمائی کا ذریعہ بنا دیا جائے تو یہ حرام ہے۔ جب سرمایہ سرمائے کی حیثیت میں Earning Agent بنتا ہے تو اس کی بدترین شکل سود ہے۔ ربا ہے ہی یہ کہ محض سرمایہ کے بل پر ایک مقرر و معین منافع حاصل کیا جائے، اس طرح کہ نقصان سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اسلام اور قرآن کی رو سے اس سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں ہے۔

اسی طرح ''جوا'' ہے۔ یہ کیا ہے؟ محض Chance کی بنا پر منافع حاصل کرنا۔ اس میں محنت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسلام کی رو سے یہ حرام ہے۔ ان دونوں صورتوں کو اسلام نے اس لیے حرام قرار دیا کہ ساری توجہ محنت پر مرکوز ہو۔ اگرچہ ظاہر بات ہے کہ محض محنت سے کچھ نہیں ہوتا۔ محنت کے ساتھ کچھ نہ کچھ سرمائے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ نہ کچھ دخل Chance کا بھی ہوتا ہے، لیکن محض Chance کی بنا پر کمائی جوا ہے اور محض سرمایہ کی بنیاد پر بے خطر کمائی ربا ہے۔

اسلامی اصولوں پر عمل کی صورتیں

اب ہم ان اصولی باتوں کا عملی زندگی پر انطباق کرتے ہیں۔ آپ کا اپنا سرمایہ ہے اور اپنی محنت بھی ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ تھوڑا ہے تو وہ چھابڑی لے کر چلے گا۔ اگر زیادہ ہو گیا تو ریڑھی بنائے گا اور گنجائش ہوئی تو کھوکھا لگا لے گا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس ضمن میں قرآن حکیم نے صرف ایک قدغن لگائی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء ۲۹)

یعنی ''لین دین جو باہمی رضامندی سے ہو۔ اگر آپ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں یا دھوکہ اور فریب سے کسی کا مال ہتھیا لیں تو آپ اخلاقی (اور قانونی) جرم کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔''

اسی طرح ایک سے زائد لوگ مل کر سرمایہ جمع کریں اور خود مل کر محنت کریں، اس کا نام شراکت ہے۔ یہ بھی بالکل جائز ہے، بلکہ پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ اس میں بھی ایک شرط عائد کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ Limited ذمہ داری کا تصور نہ ہو۔ یہ تصور حرام ہے۔ دنیا میں تمام اسکینڈلز اسی Limited Company کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ نے اپنے سرمایہ کو نکال لیا، اپنے Assets بنا لیے اور پھر کمپنی کو دیوالیہ قرار دے دیا۔ اب وہ روتے پھریں جن کو ادائیگیاں کرنا آپ کے ذمہ تھا۔ آپ کی ذاتی جائیداد سے وہ اپنا قرض وصول نہیں کر سکتے۔ شراکت کے نظام میں Total Liability ہونی چاہئے۔ ہمارے ہاں پوری صنعت کا یہی معاملہ ہے۔ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ تھوڑا سا سرمایہ اپنا لگایا اور بینک سے بہت بڑا قرض صنعت کے نام پر لے لیا۔ اس قرض ہی سے اپنا سرمایہ نکال لیا اور بہت کچھ لوٹ کھسوٹ کر Shake hand deal کا طریقہ اپنا لیتے ہیں۔ اس طرح سارا تاوان بینک پر آ جاتا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ بینک کس کا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بینک میں لوگوں کی ہی دولت جمع ہوئی ہے۔ یہ سارے سرمایہ دارانہ ہتھکنڈے ہیں جو دنیا میں ایجاد ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس شراکت کا تصور یہ ہے کہ آپ کے کاروبار میں کوئی شریک ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو آپ کو ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔ گویا آپ کو اس کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔

تیسری شکل یہ ہے کہ سرمایہ کسی اور کا ہے اور کام کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہے۔ اس شکل کو بھی شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ اس کو مضاربت کہتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہاں بھی سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ سے نفع حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی عملی صورت یہی ہے کہ سرمایہ میرا ہے اور محنت آپ کر رہے ہیں۔ گویا مجھے نفع بغیر محنت کے محض سرمائے کی بنیاد پر ہو رہا ہے! لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اصل تحفظ محنت کو حاصل ہے، سرمائے کو نہیں۔ اگر نقصان ہوتا ہے تو مکمل طور پر وہ شخص برداشت کرے گا جس نے سرمایہ لگایا ہے۔ اس تصور سے سرمایہ دارانہ ذہنیت کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی سرمایہ دار یہ کام کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ بہرحال مضاربت میں اگر نفع ہوتا ہے تو سرمایہ لگانے والا اور محنت کرنے والا برابر کے شریک ہیں۔

لیکن اس صورت سے آگے بڑھ کر محض سرمایہ کی بنیاد پر معین نفع بغیر کسی نقصان کے حاصل کرنا شریعت میں اس شدت سے حرام ہے کہ اس سے زیادہ شدت سے کوئی اور چیز حرام نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس حرام کا ارتکاب کرنے کے سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (البقرہ:۲۷۹)

''تو اس روش پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو''

آپ حیران ہوں گے کہ کسی اور گناہ پر اعلان جنگ نہیں کیا گیا!!! اگر اعلان جنگ آیا ہے تو وہ سود پر آیا ہے۔ مگر ہم اس سود کو بہت ہلکی چیز سمجھے بیٹھے ہیں۔

سود کی شناعت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کی شناعت کو ایک تمثیل سے واضح کیا ہے۔ سمجھانے کا یہ انداز خود قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ سورۂ حجرات میں غیبت کی شناعت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کی تمثیل سے واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح سود کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الربو سبعون حوبا'' سود ایسے ستر گناہوں کے برابر ہے جن میں سب سے ہلکا گناہ یہ ہے کہ ''ایسرھا ان ینکح الرجل امه'' کہ آدمی خود اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کا مرتکب ہو۔

اب اس حدیث کی روشنی میں سود کے گناہ کی شدت اور تناسب کا حساب لگایا جاسکتا ہے۔ (العیاذ باللہ) ستر گناہوں میں سے سب سے ہلکا گناہ اپنی ماں کے ساتھ بدکاری۔ استغفر اللہ۔

سود کا دائرہ

سود کے بارے میں پوری دنیا میں ایک مغالطہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ قرآن جسے ربا کہتا ہے وہ تو صرف "Usury" ہے۔ یعنی کوئی شخص ذاتی استعمال کے لیے قرض لے اور قرض دینے والا اپنی اصل سے زیادہ وصول کرے، اور واپسی کی مدت میں جتنا اضافہ ہو قرض دینے والا اسی نسبت سے اصل قرض پر اضافہ کرتا چلا جائے۔ حالانکہ ربا صرف یہی نہیں بلکہ کمرشل انٹرسٹ اور بینک انٹرسٹ بھی ربا ہے۔

یہ سعادت بھی اسی خطۂ ارضی کے حصے میں آئی ہے کہ یہاں کی وفاقی شرعی عدالت نے اپنے مبسوط اور مدلل فیصلہ میں تجارتی قرض کے انٹرسٹ اور بینک انٹرسٹ کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے ''جغادری'' دانشوروں نے عدالت میں جا جا کر دلائل دیئے کہ بینک انٹرسٹ ربا نہیں۔ ان دانشوروں میں کراچی کے خالد ایم اسحاق صاحب اور لاہور سے ایس ایم ظفر بھی شامل ہیں۔ ان سب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن دلائل میں مار کھائی۔ اللہ تعالیٰ جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کو اجر عطا فرمائے جنہوں نے کمال جرأت کے ساتھ مدلل فیصلہ دیا۔ عہد حاضر میں بینک انٹرسٹ کو حرام قرار دینا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔

زمین کا مسئلہ

اب میں اس سے بھی زیادہ "Senstive issue" کی طرف آ رہا ہوں، اور وہ ہے زمین کا مسئلہ۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ جن تین خرابیوں کو نکال کر کسی بھی نظام معیشت کو اسلامی بنایا جاسکتا ہے، ان میں سے ایک جاگیرداری اور غیر حاضر ملکیت زمین (Absentee Land Lordism) کا نظام بھی ہے۔ اس بات کو آپ یوں سمجھئے کہ زمین آپ کی ہے، آپ محنت کریں، خوب محنت کریں اور زیادہ سے زیادہ فوائد پیداوار حاصل کریں ''چشم ماروشن دل ماشاد''۔ لیکن اصل مسئلہ پیدا اس وقت ہوتا ہے جب زمین کسی اور کی ہو اور محنت کوئی دوسرا کرے۔ ایک اور صورت یہ ہوسکتی ہے کہ زمین بھی جمع کریں اور محنت بھی، جیسے ''شراکت'' میں ہوتا ہے۔ اس طرح آپ "Collective Farming" کر سکتے ہیں گویا آپ نے وسائل اور محنت جمع کر دی۔ لیکن یہ سارا معاملہ رضا کارانہ اور فریقین کی آزاد مرضی سے ہونا چاہئے۔ اس میں کسی قسم کے جبر کا دخل نہیں ہونا چاہئے۔

زمین کی زراعت کی ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمین مثلاً میری ہے لیکن کاشت کوئی اور کرے۔

اس ضمن میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، اس کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک اصول کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے، کیونکہ جب تک حکم کی منطق سمجھ میں نہیں آئے گی اس وقت تک بات پوری طرح گرفت میں نہیں آئے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ زمین کے سلسلہ میں مضاربت کا اصول نہیں چل سکتا، کیونکہ مضاربت میں سرمایہ لگانے والے کو منافع میں حصہ دینے کا جواز اس بنیاد پر پیدا ہوا تھا کہ نقصان کی صورت میں نقصان سارا سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا لیکن یہاں سرمایہ زمین ہے۔ زمین کا کیا بگڑے گا وہ تو جوں کی توں موجود رہے گی جبکہ سرمایہ کل کا کل یا اس کا کوئی حصہ ڈوب سکتا ہے، مگر زمین کی صورت میں صرف کارکن کی محنت ڈوبتی ہے۔ لہٰذا مضاربت کا معاملہ زمین میں نہیں ہوسکتا۔ اگر سرمایہ دار (زمین کا مالک) نقصان میں بھی شریک ہوسکتا تو مضاربت کی طرح مزارعت بھی جائز ہوتی۔

مزارعت کے بارے میں ائمہ فقہ کے مسلک

مزارعت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں کے نزدیک مطلقاً حرام ہے۔ پھر مزارعت کیسے اور کیونکر جائز ٹھہرائی گئی؟ اس کی وضاحت میں کروں گا۔ فقہ حنفی میں اس کی حلت کا فتویٰ صاحبین (قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) نے دیا، لیکن ہمارے چوٹی کے دو ائمہ اس کے حرام مطلق ہونے کے قائل ہیں۔ ان دونوں ائمہ کی اہمیت اس حوالے سے بھی ہے کہ ان میں سے امام ابوحنیفہ ؒ کو اہل الرائے کا سرخیل تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ امام مالکؒ اصحاب حدیث کے سرخیل ہیں۔ گویا دونوں مکاتب فکر کے Top Most ائمہ مزارعت کو حرام مطلق سمجھتے ہیں۔ حرام ہونے کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مزارعت کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پورے جزم کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ مزارعت حرام ہے، جائز نہیں ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ شرائط عائد کر کے مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مزارعت کا نظام ان شرائط کو بھی پورا نہیں کرتا۔ کچھ عرصہ قبل کلاچی کے مشہور عالم اور قاضی عبداللطیف کے بڑے بھائی جناب مولانا قاضی عبدالکریم صاحب سے میری خط و کتابت اسی موضوع کے بارے میں ہوئی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مروجہ مزارعت کو کون حلال کہتا ہے؟ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے جائز نہیں کہتے، بلکہ جواز کے لیے بڑی کڑی شرطیں عائد کرتے ہیں۔ یہ معاملہ غیر حاضر مالک زمین "A bsentee Land Lordship" کا ہے۔ تم اپنی زمین خود کاشت کرو۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس کر رہے ہو تو تم نے سودی معاملہ کیا۔

نظام جاگیرداری

اب ہم جاگیرداری کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے ہاں جاگیرداری کی جو مصیبت ہے اسے شمشیر فاروقی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

(بہتر یہ ہے کہ تم اسے مسلمان بنالو، اور قرآن کی تلوار سے اسے مار دو)

جاگیرداری کے خلاف حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ بہت بڑا اجتہاد تھا جو اجماع کی شکل اختیار کر گیا۔ ان معاشی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں کی مذہبی سیاسی جماعتوں نے اسلام کا نعرہ تو لگا دیا لیکن ان مسائل کو چھیڑا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے ذہن میں نفاذ اسلام کا بس یہی تصور ہے کہ کوڑے لگیں گے اور ہاتھ کٹیں گے!! ظاہر ہے کہ وہ اسلام سے بھاگیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے۔ اسلامی نظام کی برکات کو تو سامنے لایا ہی نہیں گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں کی دو مذہبی سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے انتخابی منشور میں ''تحدید ملکیت زمین'' کا مسئلہ اٹھایا ہے، یعنی ایک مخصوص شرح سے زیادہ کسی شخص کے پاس زمین نہیں رہنے دیں گے۔ فرض کیجئے کہ یہ شرح ۲۵/ ایکڑ ہے۔ تو اب جس کی ملکیت مثلاً پانچ سو ایکڑ ہے اس کی پونے پانچ سو ایکڑ کس دلیل کی بنیاد پر آپ واپس لیں گے؟ آپ کے ملک میں سپریم کورٹ کی شریعت بنچ مفصل فیصلہ دے چکی ہے کہ آپ کسی کی ملکیت میں سے کوئی شے جبراً نہیں لے سکتے۔ اگر کسی قومی ضرورت یا تقاضے کے تحت کوئی شے لینا ناگزیر ہو جائے تو مالک کو معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ گویا آپ شرعی دلیل کے بغیر ایک انچ زمین بھی نہیں لے سکتے۔

ہمارے پاس الحمدللہ دلیل موجود ہے۔ ہم نے اس موضوع پر بحث کا آغاز ایک عرصے سے کر دیا ہے اور یہ بحث وسیع حلقے میں پھیل رہی ہے۔ ظاہر ہے قیل و قال و بحث و نزاع ہی سے ایک مسئلہ نکھر کر سامنے آئے گا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ جاگیرداری کو شمشیر فاروقیؓ سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے جاگیرداری کے خلاف جو اجتہاد کیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب عراق، شام، ایران اور مصر فتح ہوئے تو اس وقت مجاہدین کی تعداد چند ہزار ہی تھی...... مسلمانوں کی فوج کی تعداد لاکھوں تک نہ پہنچی تھی۔ مجاہدین نے کہا کہ یہ تمام زمینیں اور علاقے ہم نے فتح کئے ہیں، سب مال غنیمت ہیں۔ اس میں سے بیت المال کا حصہ صرف ۵/ ا ہے، باقی چار حصے جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ساری زمین اور اس کے کاشتکار مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ کاشتکار ہمارے غلام اور زمینیں ہماری جاگیر ہوں گی۔ ابتداً میں یہ مطالبہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے

کچھ ساتھیوں نے کیا۔ پھر یہ مطالبہ زور پکڑ گیا۔عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما بھی کھڑے ہو گئے۔اس موقع پر حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت نے عام مجاہدین کی اس رائے کو ناپسند کیا۔اور حضرت عمرؓ کا مقام وہ ہے جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الحق ینطق علی لسان عمر

یعنی ''حق عمر کی زبان سے گویا ہوتا ہے۔''

آپ ﷺ نے مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ:

لو کان بعدی نبیا لکان عمر

یعنی ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہی ہوتے''

چنانچہ اس نازک مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بصیرت کا مشاہدہ سب ہی نے کر لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس وقت مجاہدین کا مطالبہ مان لیا جاتا تو عالم اسلام میں دنیا کا بدترین جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا۔مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مطالبہ کی سخت مخالفت کی۔ان کا اجتہاد قرآن پر مبنی تھا۔جس سے ان کے مطالعۂ قرآن کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں ''اموال فے'' کا حکم سورۂ حشر میں بیان ہوا ہے جو کل کا کل بیت المال میں داخل کیا جاتا ہے اور مجاہدین میں اسے تقسیم نہیں کیا جاتا۔امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ مفتوحہ علاقے مال غنیمت نہیں بلکہ مال فے ہیں۔مال غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال پر ہو گا جو عین محاذ جنگ میں ہاتھ آئیں۔ان اموال میں جنگی آلات مثلاً تلواریں، نیزے اور ڈھالیں وغیرہ، یا دشمن اپنے کھانے کی لیے جو مال مویشی، بھیڑ، بکری ساتھ لاتا ہے۔اسی طرح سواری اور بار برداری کے جانور اونٹ، گھوڑے اور خچر وغیرہ شامل ہیں۔جب کہ زمین وغیرہ ''فے'' ہیں جو کل بیت المال کی ملک ہے۔یہ کسی کی انفرادی ملک نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس رائے کی تائید اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضوان اللہ علیہم بھی کر رہے تھے۔لیکن ان جلیل القدر صحابہ کی رائے کے باوجود اس معاملہ پر بہت ردوقدح ہوا۔یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی رائے کے حق میں چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔بالآخر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ''لینڈ کمیشن'' مقرر کیا۔اس کمیشن میں کسی مہاجر کو شامل نہیں کیا گیا کیونکہ زراعت پیشہ نہ ہونے کی وجہ سے زراعت کے مسائل سے ناواقف تھے۔یہ حضرات مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اس وادیٔ غیر ذی زرع میں تجارت اور کاروبار ہی ذریعہ معاش تھا۔کمیشن میں پانچ انصاری قبیلہ خزرج میں سے اور پانچ انصاری قبیلہ اوس میں سے شامل کئے گئے۔اس لینڈ کمیشن نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا اور اسی پر اجماع ہو گیا۔اس اجتہاد کی رو سے اسلامی قانون میں زمین کی مستقل دو قسمیں تا قیام قیامت وجود میں آ چکی ہیں۔

زمینوں کی دو اقسام

زمین کی ایک قسم وہ ہے جس کے مالک کسی جنگ وجدال کے بغیر ایمان لے آئے ہوں۔ایسی زمین انہی کی ملکیت شمار ہو گی اور اس کی پیداوار میں سے عشر وصول کیا جائے گا، ایسی زمین کو عشری زمین کہا جاتا ہے۔

اس قسم کی زمین کی سب سے نمایاں مثال مدینہ منورہ کی زمینیں ہیں۔مدینہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح نہیں کیا تھا، بلکہ وہاں کے لوگوں نے خود آنحضرت ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی۔

عشر دو طرح کا ہوتا ہے، جو زمین بارش یا قدرتی ذرائع سے سیراب ہوتی ہو تو اس سے پورا عشر یعنی پیداوار کا ۱۰ فیصد وصول کیا جائے گا۔لیکن جس زمین کی آبپاشی مصنوعی طریقہ پر ہو، جس میں کاشتکار کو اخراجات ادا کرنے پڑیں، مثلاً آبیانہ ادا کرنا پڑے یا ڈیزل، بجلی خرچ ہو تو اس پر نصف عشر یعنی پیداوار کا ۵ فیصد وصول کیا جائے گا۔

زمین کی دوسری قسم وہ ہے جسے خراجی کہا جاتا ہے۔یہ ان علاقوں اور ملکوں کی زمینیں ہیں جو بزور شمشیر فتح ہوئے ہیں۔ایسی زمینیں مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں، گویا یہ اسلامی ریاست کی ملکیت ہیں۔اس زمین میں کسی کا ایک انچ ملکیتی رقبہ نہیں ہے۔جو لوگ پہلے سے ان زمینوں پر قابض تھے وہ عیسائی ہوں، مجوسی ہوں، قبطی ہوں یا یہودی ہوں وہ کاشت کار کی حیثیت سے ہوں گے اور وہ زمین کا خراج براہ راست خود بیت المال کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گئے۔خراج کی شرح اسلامی حکومت اپنے اجتہاد سے مقرر کرے گی۔مسلمانوں کا بیت المال نظام خلافت کا سب سے بڑا Source of revenue ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذکورہ بالا اجتہاد کی روشنی میں مسلمانان پاکستان کے لیے زمینوں کا مسئلہ حل کرنا مشکل نہیں رہا۔ ہم اس مسئلہ کو شریعت کے مطابق حل کر سکتے ہیں۔ اسلامی شریعت کی رو سے پاکستان کی ایک انچ زمین کسی کی ملکیتی زمین نہیں ہے، کیونکہ پاکستان کے تمام علاقے بزور شمشیر فتح ہوئے تھے۔ اب کسی اور دلیل سے ملکیت ثابت نہیں کی جا سکتی۔ یہ زمین خراجی ہے جو کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ ہے وہ شمشیر فاروقی جسے ہاتھ میں لے کر اراضی کا ایک نیا بندوبست کیا جا سکتا ہے، جس سے جاگیرداری کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ جو لوگ اب تک اس اصول کے خلاف زمینوں پر ملکیت کا دعویٰ کر کے اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں ان کو اسی قسم کی چھوٹ دی جا سکتی ہے، جیسی اللہ تعالیٰ نے سود پر قرض دینے والوں کو رعایت دی تھی، یعنی جو سود پہلے لیا جا چکا ہے اسے معاف کیا جاتا ہے، آئندہ کے لیے سود لینا قطعی حرام ہے۔ زمینوں کی آمدنی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب مستقبل میں زمینوں پر تمام قابض لوگوں کی حیثیت کاشتکاروں کی ہے اور اسی حیثیت میں وہ زمینوں سے استفادے کے مجاز ہوں گے۔

نئے بندوبست اراضی کے بعد جو لوگ پہلے سے زمین کاشت کر رہے ہیں وہ بعد میں بھی زمین کاشت کرتے رہیں گے، آخر وہ بھی مسلمان ہیں اور اسی معاشرے کے افراد ہیں۔ اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اچھی طرح گزارے کے لائق صحیح یونٹ کتنے ایکڑ پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جو پیداوار کے اعتبار سے اور انتظامی اعتبار سے بہتر ہو، وہ یونٹ سب کو دیا جائے۔ اب کاشتکار اور بیت المال کے بیچ میں نہ کوئی جاگیردار ہوگا نہ زمیندار، بلکہ خراج براہِ راست بیت المال کو ادا کیا جائے گا۔ اس طرح بہت سی لعنتی قسم کی کٹوتیوں اور ٹیکسوں سے کاشتکار کی جان چھوٹ جائے گی۔

اس وقت ہمارے ملک میں علمائے کرام نے پاکستان کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے بحث شروع کر دی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس معاملے پر کھل کر بحث ہو تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے اور انہوں نے پاکستان کی زمینوں کو عشری قرار دیا ہے۔ ان کے دلائل اپنی جگہ لیکن آزادانہ بحث و مباحثہ بہر حال ضروری ہے۔

میں اس بحث میں ایک حوالہ پچھلی صدی کے ہندوستان کے چوٹی کے علماء میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا دینا چاہتا ہوں۔ قاضی صاحب محتاج تعارف نہیں ہیں۔ تفسیر مظہری کے مصنف اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز تھے۔ انہوں نے فقہ کے بنیادی مسائل پر ایک رسالہ ''مالا بدمنہ'' کے نام سے لکھا ہے۔ اس رسالے میں آپ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان کی ساری زمینیں چونکہ خراجی ہیں اس لیے میں عشر کے مسائل نہیں لکھ رہا ہوں''۔ فقہ کا یہ رسالہ آج بھی ہمارے تمام قدیم مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔

پاکستان کی زمینوں کے حوالے سے علمی سطح پر گفتگو ضرور ہونی چاہیے، بلکہ ان زمینوں کی شرعی حیثیت کا اب باقاعدہ فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ میں نے ضیاء الحق مرحوم کی شوریٰ میں یہ تجویز دی تھی کہ آپ ایک لینڈ کمیشن بنائیے، اس کمیشن میں پاکستان کے نہ صرف جید علماء کو شامل کیا جائے بلکہ بندوبست اراضی کے ماہرین کی خدمات بھی لی جائیں۔ علماء وہ شامل کیے جائیں جو اجتہادی بصیرت رکھتے ہوں اور جو قرآن و سنت کے اصل اہداف کو سامنے رکھ سکیں۔ پھر اس کمیشن کو آزادانہ کام (Free Hand) کا موقع دیجیے تاکہ وہ یہاں کی زمینوں کی شرعی حیثیت متعین کر دے۔ تاہم، میں تو یہی عرض کروں گا کہ اس ضمن میں بھی اصل ذمہ داری ان مذہبی سیاسی جماعتوں پر ہے جو اپنے منشور میں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ زمین کی ملکیت کی ایک حد متعین کر دیں گے۔ جبکہ اس تحدید کے لیے دلیل ان کے پاس کوئی نہیں ہے۔

قمار (یا) جوا

اب میں ان تین باتوں میں سے تیسری بات کی طرف آتا ہوں جس کو نکال دینے سے ہر معاشی نظام کو نظامِ خلافت کے معاشی ڈھانچے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، وہ تیسری چیز ہے جوئے کا خاتمہ۔[۲]

دورِ ملوکیت کے مفاسد

یہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ دورِ ملوکیت کے آغاز ہی میں اسلامی تاریخ بہت سے حادثات سے دوچار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ کربلا کا واقعہ، حرہ کا واقعہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت، پھر حجاج بن یوسف کے ہاتھوں سینکڑوں تابعین کا شہید ہونا، اس کے علاوہ حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا واقعہ۔ یہ تمام خرابیاں اور حادثات اپنی جگہ، لیکن میرے نزدیک دورِ ملوکیت کی اصل خرابیاں مالیاتی ہیں۔ بنو امیہ کا دور تو ملوکیت کا نقطۂ آغاز تھا۔ ملوکیت نے گہری جڑیں تو دورِ بنو عباس میں پکڑی تھیں۔ ابتداء میں نہ کوئی شرک کا فتنہ تھا، نہ کوئی باطل عقائد اسلام میں در آئے تھے، نہ معتزلہ پیدا ہوئے تھے اور نہ بدعات کا طوفان کھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف خرابی صرف سیاسی اور دستوری سطح پر آئی تھی کہ خلافت شورائی نہیں رہی تھی موروثی ہو گئی تھی۔ لیکن دوسری طرف سب سے بڑی خرابی مالیاتی امور میں در آئی تھی۔ اس ضمن میں ایک بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ جاگیرداری کی حیثیت ملوکیت کے لیے پاؤں کی ہے۔ گویا سب جاگیردار ملوکیت کے ''پاؤں'' ہوتے ہیں۔ لہٰذا دورِ ملوکیت میں پہلا کام یہ ہوا کہ بڑے بڑے رقبے دے کر لوگوں کو نوازنا شروع کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پہلے اور

آخری صاحب اختیار مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا تجدیدی کارنامہ یہی تھا کہ اس وقت تک جتنی بھی جاگیریں عطا کی گئی تھیں ان سب کی دستاویزات منگوائیں اور قینچی سی کتر کران کا ڈھیر لگا دیا۔

فقہ پر ملوکیت کے اثرات

علامہ اقبال، جن کو مصور پاکستان کا لقب بھی دیا گیا ہے، انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے پاکستان کا نام لیے بغیر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ اسی خطبہ الہ آباد میں انہوں نے ایک اور اہم بات کہی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> ''اگر ہم ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے لیے یہ موقع پیدا ہو جائے گا کہ ہم اسلام کی اصل تعلیمات جن پر دورِ ملوکیت اور اورعرب امپیریلزم (Arab Imperialism) کے دوران پردے ڈال دیئے گئے تھے ان کو ہٹا کر اسلام کی صحیح صورت دنیا کے سامنے پیش کریں۔''

یہ ہے علامہ اقبال کا پاکستان کے بارے میں تصور جس کی طرف ابھی تک ہمارا رخ بھی نہیں ہوا۔ علامہ اقبال کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام پر عرب ملوکیت کے اثرات کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملوکیت نے ہماری فقہ پر بھی اثرات ڈالے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ ؒ نے سختیاں جھیلیں، جیل جانا قبول کیا، مگر قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہیں کیا، جبکہ ان کے شاگرد نے یہ عہدہ بہر حال قبول کیا۔ میں قاضی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی نیت پر ہرگز حملہ نہیں کر رہا، مگر انہوں نے اپنی مصلحت، امت کی مصلحت یا حالات کا تقاضا سمجھ کر یہ عہدہ بہر حال قبول کیا۔ اس طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے طرزِ عمل میں بہر حال فرق تو واقع ہو گیا۔ اب قاضی ابو یوسف ملک کے چیف جسٹس ہیں، لیکن جو برائی آ چکی ہے وہ اس کو دفع کیسے کریں؟ چنانچہ ''نظریہ ضرورت'' کے تحت قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے بعض کڑی شرائط لگا کر مزارعت کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے۔ ان شرائط میں مثلاً یہ شرط بھی ہے کہ مالک زمین اور بیج بھی مہیا کرے اور مزید فلاں فلاں چیزیں بھی مالک کے ذمہ ہیں، تاکہ اگر فصل تباہ ہو تو کچھ نہ کچھ نقصان زمیندار کو بھی تو اٹھانا پڑے۔ سارا تاوان بیچارے کاشتکار پر تو نہ آئے۔

یہ ''نظریہ ضرورت'' آج بھی مؤثر ہے۔ چنانچہ جب مارشل لاء آ جاتا ہے تو ہماری عدالت عظمیٰ بھی اس کو اسی نظریہ ضرورت کے تحت قبول کر لیتی ہے۔ اب عدالت فوج سے لڑ تو نہیں سکتی۔ ایسی صورت میں عدالتیں زیادہ سے زیادہ کچھ شرطیں لگا سکتی ہیں، مثلاً یہ کہ انتخابات نوے دن کے اندر کرائے جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ نوے دن پھیلتے پھیلتے گیارہ سال پر محیط ہو جائیں۔

یہ بعینہ وہی چیز ہے جس کو پہلے بھی میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے فقہاء نے متغلب کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا ہے، کیونکہ بدامنی اور انارکی بہر حال قابل قبول نہیں۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں یہی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ ملوکیت کا راستہ روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ان ملوک کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

بہر حال میرے نزدیک مزارعت زمین کا سود ہے۔ اس ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ بھی موجود ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے اس حدیث کی ایک دوسری تاویل کی ہے۔ حدیث یہ ہے کہ:

> ''ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک کھیت میں کام کرتے دیکھا۔ آپؐ حیران ہوئے کہ حضرت رافع بن خدیج ؓ تو مہاجر ہیں۔ آپؐ نے سوال کیا یہ کس کا کھیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ زمین فلاں انصاری کی ہے۔ میں اس پر محنت کر رہا ہوں۔ پیداوار ہمارے درمیان تقسیم ہو جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''فقد اربیتما'' ''تم دونوں نے تو یہ سودی معاملہ کیا ہے اور مزید ارشاد فرمایا: ''رد الارض الی اھلھا'' ''زمین اس کے مالک کو واپس کر دو۔''

بعض حضرات نے اس حدیث مبارکہ کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ ممانعت ایک مخصوص قسم مزارعت کے لیے تھی، جس کی رو سے تقسیم پیداوار کا طریقہ یہ تھا کہ نالیوں کے پاس پیدا ہونے والی فصل مالک زمین کو اور دور دور پیدا ہونے والی فصل کاشتکار کو دی جائے گی۔ اس تاویل سے حدیث کو خاص کر لیا گیا، ورنہ خود حدیث کے الفاظ تو عام ہیں۔ بہر حال آپ کے سامنے میں نے اپنی رائے رکھ دی ہے۔

ہم نے اس موضوع پر مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کی ایک کتاب ''مروجہ نظام زمینداری اور اسلام'' کے نام سے شائع کی ہے۔ انہوں نے جو بات کی ہے دلائل سے کی ہے۔ کتاب کی اشاعت سے قبل ہم نے اسے پہلے ''حکمت قرآن'' اور ''میثاق'' میں شائع کیا تھا۔ اور وہ شمارے جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے بعض علماء کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ متعدد علماء نے ان مضامین پر بڑی تنقید کی اور ان کو غلط قرار دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تنقید لکھیں تاکہ ہم اس کو شائع کریں، مگر تنقید لکھنے کی زحمت کسی نے نہ کی۔

بیع مؤجل اور بیع مرابحہ

جیسا میں نے عرض کیا کہ ہم نے عہد حاضر میں اہم مسائل پر گفتگو کا آغاز کیا ہے تاکہ بات نکھر کر سامنے آئے۔ اس وقت ایک بحث بیع مؤجل اور بیع مرابحہ کے حوالے سے بھی جاری ہے۔

بیع مؤجل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ کوئی چیز نقد رقم ادا کر کے لیں تب تو مثلاً آپ سے ۱۰۰ روپیہ قیمت وصول کی جائے گی، لیکن اگر آپ قیمت سال بھر کے بعد ادا کریں تو قیمت مثلاً ۱۲۰ روپیہ وصول کی جائے گی۔ ہمارے ہاں اس کے جواز کا بھی فتویٰ دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں، میں یہ عرض کروں گا کہ عقل اور منطق کے استدلال سے اس میں اور سود میں فرق کیا ہے؟ وہ چیزیں جو بازار میں نقد قیمت پر دستیاب ہیں، ان کو اگر آپ قسطوں پر لیں اور قیمت زیادہ ادا کریں، تو قیمت میں جو اضافہ ہے اسے سود کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ اس جواز کا کوئی متعین فتویٰ بھی نہیں ہے۔ بس ایک عبارت کہیں سے نکلی ہے جس کے الفاظ کچھ اس طرح پر ہیں ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس کا رواج ہے۔'' اب اس عبارت کو لے کر ہمارے ہاں سارا قسطوں کا جو کاروبار ہو رہا ہے اس کا جواز ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اسی سے ضیاء الحق صاف نے سود کو مشرف با سلام کیا ہے۔ آپ کسی بینکار سے PLS کے حوالے سے پوچھ لیں، وہ صاحب کہے گا کہ سود ہے، ہم نے صرف نام تبدیل کیا ہے۔ اس طرح مختلف فقہی حیلوں سے بیع مؤجل کے جواز کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

صرف ایک صورت استثناء کی یہ ہو سکتی ہے کہ ایک چیز جو نقد مل ہی نہیں رہی ہے یا کوئی چیز ایسی ہے جس کی نقد اور ادھار قیمت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً معاملہ یوں طے ہوا ہو کہ قیمت جو بھی آج طے ہوگئی ہے اس کی ادائیگی ایک سال بعد ہوگی تو یہ صورت بہر حال سود کی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ اگر طے شدہ مدت میں قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی اور اس میں کچھ اضافہ کرنا پڑا تو مدت ادائیگی میں اضافے کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے گا، کیونکہ یہ اضافہ سود ہوگا۔

اسی طرح کا معاملہ ''بیع مرابحہ'' کا ہے۔ بیع مرابحہ کیا ہے؟ اس کو آپ یوں سمجھئے کہ مجھے بازار سے کوئی چیز خریدنی ہے، لیکن میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ آپ بازار سے خرید کر مجھے لا دیجئے، میں اس پر آپ کو اتنا نفع دے دوں گا۔ مثلاً آپ سو روپیہ کی چیز خریدتے ہیں تو میں آپ کو دس روپیہ زائد دے دوں گا۔ یہ دراصل اس شخص کی محنت کا معاوضہ ہے اور بالکل جائز ہے۔ اسے ایک طرح کی وکالت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، مگر اس وقت اسی کو بنیاد بنا کر بینکنگ کے نظام کو ''نام نہاد اسلامی'' بنا دیا گیا ہے، جو نظام سود پر مبنی ہے۔

دورِ ملوکیت کے باقیات سیئات

اس حوالے سے میں علامہ اقبال کا ذکر کر چکا ہوں۔ انہوں نے اس دور میں بہت گہری حقیقت تک رسائی حاصل کی تھی۔ دورِ ملوکیت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے انہیں خوب سمجھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود ابلیس کی زبان سے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کہلوایا تھا: ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دورِ ملوکیت میں یہ چیزیں رفتہ رفتہ ہمارے ہاں در آئی ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم نے انہیں کل دین سمجھ لیا ہے۔ جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن و سنت کے اصل اہداف کی طرف پلٹا جائے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عہد حاضر میں عوام کی فلاح و بہبود اور عدل و قسط کے تقاضے کیا ہیں۔ آج کے دور میں اصل اہمیت اجتماعی نظام کی ہے۔ اس کے علاوہ خود شریعت کے نزول کا مقصد ہی نظام قسط و عدل کا قیام ہے۔ چنانچہ سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

''ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات اور واضح تعلیمات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل اور قسط پر قائم ہوں۔''

اس کے برعکس اگر "Haves and have nots" کے درمیان گہری خلیج موجود ہے، انسانیت مترفین اور محرومین، مستضعفین اور متکبرین میں تقسیم ہے تو ظاہر بات ہے کہ نزول شریعت کا اصل مقصد تو حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

موجودہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں بھی ایک چیز موجود ہے، اگرچہ اسلام نے وہ چیز اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے۔ مغربی سرمایہ داری نظام میں وہ چیز بے روزگاری الاؤنس (Unemployment Allownce) ہے۔ اس وقت تقریباً تمام یورپی ممالک میں اجتماعی بہبود (ویلفیئر) کا نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، جب کہ یہ نظام اعلیٰ ترین شکل میں اسکینڈے نیوین ممالک میں موجود ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں جس اسکول کے اندر ایک Billionare کا بچہ پڑھتا ہے اسی اسکول میں اس شخص کا بچہ بھی پڑھتا ہے جس کی گزر اوقات

محض Welfare Allownce پر ہے۔ یہی معاملہ علاج معالجہ اور دیگر بنیادی سہولیات میں بھی کارفرما ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فلاحی ریاست کی جو بلند ترین سطح ممکن ہے وہ Scandanavian Countries میں موجود ہے۔ برطانیہ بھی اس کے آس پاس نہیں پہنچ سکا جب کہ امریکہ تو ابھی بہت دور ہے۔

اسلام نے بھی یہی شے اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے، مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں اسے Internal Management of Capital کی اصطلاح سے پہچانتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر کھلے مقابلے کا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کچھ لوگ بہت آگے چلے جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ اب اس gap کو کم کرنے کے لیے کوئی Feed Back ہونا چاہئے، ورنہ ان دو طبقات میں خلیج زیادہ ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بھوکے، پیٹ بھروں کا پیٹ چاک کریں گے۔ لہٰذا اب ان کو کچھ کھلا پلا کر چپ رکھنا ہے۔ دراصل یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اسلام نے اسی مقصد کو زکوٰۃ کے ذریعے پورا کیا ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کو محض ٹیکس کے طور پر لاگو نہیں کیا بلکہ اس کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام میں ٹیکس سے بچنا تو آدمی اپنا حق سمجھتا ہے! چنانچہ اس مقصد کے لیے مختلف قانونی ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی مدد کے لیے بڑی بڑی فرمیں ہوتی ہیں جو بڑی بھاری فیسیں لے کر انہیں راستے بتاتی ہیں کہ اس طرح کرو گے تو ٹیکس سے بچ نکلو گے اس کے برخلاف اسلام نے زکوٰۃ کو عبادت کا درجہ دیا ہے، لہٰذا کوئی مسلمان اس کو Avoid نہیں کرے گا۔

زکوٰۃ کی حقیقت

اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ زکوٰۃ اصل میں ہے کیا؟ زکوٰۃ کے بارے میں حدیث رسولؐ میں ہے:

((توخذ من اغنیاء هم وترد علی فقراء هم))

''(زکوٰۃ) ان کے اغنیا سے لی جائے گی اور انہی کے فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی۔''

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ غنی سے مراد Billionare نہیں ہے، نہ ہی فقیر سے مراد اس قدر بھوکا ہے کہ فاقے آ رہے ہوں، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس سات تولے سونے یا باون تولے چاندی کی مالیت ہے تو آپ معطی (doners) میں شامل ہیں۔ گویا آپ غنی ہیں۔ لیکن اگر اس مالیت کے مالک نہیں ہیں تو آپ عطیہ لینے کے حقدار (recipient) ہیں۔ اس طرح دینے والے اور لینے کے حقدار کے درمیان ایک فصیل کھینچ دی گئی ہے۔

اس موقع پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس زکوٰۃ کے نظام پر بہت بڑا ظلم ہمارے مرحوم صدر ضیاء الحق نے کیا ہے۔ زکوٰۃ آرڈی نینس اور زکوٰۃ کے نظام کو خالص اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ایک منظم بھیک کا نظام وجود میں آ گیا۔ زکوٰۃ کا اصل نظام کفالت عامہ کے لیے ہے۔ اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ذمہ داری قبول کرنا پڑے گی۔ ہمارے ہاں کسی زمانے میں روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ یہ نعرہ غیر اسلامی ہرگز نہیں تھا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ نعرہ لگانے والے جاگیردار تھے۔ ان جاگیرداروں نے اپنے وقتی سیاسی مقاصد کے لیے اس نعرے کو استعمال کیا۔ ان میں کسی کی نیت کچھ کر گزرنے کی نہ تھی، ورنہ ضرور کچھ نہ کچھ عملی اقدامات کئے جاتے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ زکوٰۃ کے نظام کے ساتھ جو کچھ ضیاء الحق مرحوم نے کیا وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اس شخص نے زکوٰۃ کے نظام کو بدنام کیا ہے۔ ضیاء الحق کا زکوٰۃ کا نظام یہ ہے کہ "Fixed deposit" کے اندر سود کا ایک حصہ لے کر اسے زکوٰۃ کا نام دے دیا گیا۔ جب کہ زکوٰۃ کا اصل نظام نافذ ہی نہیں کیا گیا۔

زکوٰۃ کا اصل نظام

زکوٰۃ کا اصل نظام ہے کیا؟ وہ نظام یہ ہے کہ تمام اموال تجارت پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نافذ کی جائے گی۔ فرض کیجئے آپ کی دوکان میں پانچ لاکھ کا مال پڑا ہوا ہے۔ آپ سے اڑھائی فیصد کے حساب سے لیا جائے گا۔ اس طرح آپ کی کہ انکم (ٹیکس) سے کوئی بحث سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس بات کا بھی امکان ہے انکم تو کجا گزشتہ سال چھ لاکھ کا مال رہا ہو اور اس سال پانچ لاکھ کا رہ گیا ہو۔ زکوٰۃ ایک لاکھ کے خسارے کے بعد بھی دینی ہوگی۔ جب تک کوئی شخص صاحب نصاب ہے اسے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اگر کوئی نصاب سے نیچے ہے تو اب اس کا شمار لینے والوں میں ہو جائے گا۔ آپ کے پاس جتنا بھی مالِ تجارت گودام میں یا دوکان میں ہے آپ کو اس کا اڑھائی فیصد دینا ہوگا۔ اگر کوئی کارخانہ ہے تو مشنری، زمین اور عمارت مستثنیٰ ہوں گے۔ اس کے علاوہ جتنا بھی خام مال اور تیار شدہ مال موجود ہے اس سب پر زکوٰۃ نافذ ہوگی۔

زکوٰۃ کے نظام کو اگر اس کی اصل روح کے ساتھ نافذ کر دیا جائے تو اسکینڈے نیوین ممالک سے کہیں بہتر ویلفیئر کا نظام لایا جا سکتا ہے۔ اس ویلفیئر کے نظام کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت گردش میں آئے گی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر عوام کی قوت خرید میں اضافہ ہوگا تو اس سے کاروبار میں تیزی آئے گی۔ اس طرح اس کی برکات پھر لوٹ کر پورے معاشرے میں پھیل جائیں گی اور پورے معاشرے میں خوشحالی آئے گی۔ اس خوشحالی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ بھی معاشرے کا جزو ہونے کی وجہ سے مستفید ہوں گے اور آپ کو بھی Feed Back مل جائے گا۔

زکوٰۃ کے نظام کے حوالے سے ایک بات اور بھی سمجھ لینی چاہئے کہ مال کی دو قسمیں ہیں، بالکل اسی طرح جیسے زمین کی دو قسمیں ہیں۔ مال کی دو قسمیں یہ ہیں (i) اموال ظاہرہ اور (ii) اموال باطنہ۔ مال کی ان دونوں اقسام کو سمجھنے سے تاریخ اسلام کے اس واقعہ کی حقیقت بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ خلافت راشدہ کے دور میں لوگ زکوٰۃ لیے پھرتے تھے مگر زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا۔ خلافت راشدہ میں زکوٰۃ تو بیت المال وصول کرتا تھا، یہ زکوٰۃ لے کر پھرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس سوال کا جواب اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی تقسیم سمجھنے سے واضح ہو جائے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ اموال ظاہرہ یعنی وہ مال جو مخفی نہیں ہے، مثلاً سامان تجارت جو دوکان یا گودام میں موجود ہے۔ اس مال کو جیب میں یا تکیہ کے نیچے رکھ کر چھپایا تو نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مویشیوں کے گلے ہیں ان کی گنتی بھی باآسانی ممکن ہے۔ اسی طرح کارخانے میں جن کی مصنوعات آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اتنا دھاگہ ہے، اتنا کپڑا ہے، اتنی روئی ہے، چنانچہ یہ اور اسی طرح کے تمام اموال ظاہرہ پر نظام خلافت میں زکوٰۃ عائد کی جائے گی اور جبراً بھی وصول کی جائے گی، کیونکہ نظام خلافت کے تحت ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ جبراً بھی وصول کی جائے گی، [۴] یہ جبری وصولی اموال ظاہرہ سے ہی کی جائے گی اور ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے گا۔

لیکن اموال کی دوسری قسم ''اموال باطنہ'' جیسے کہ وہ نقدی یا زیور جو آپ نے اپنے گھر میں کسی آڑے وقت کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ ان کی تلاشی نہیں لی جائے گی، نہ ان اموال کی زکوٰۃ جبراً وصول کی جائے گی۔ یہ آپ کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ اس میں آپ کو یہ آزادی حاصل ہے کہ چاہیں تو زکوٰۃ ریاست کو دے دیں، چاہیں تو اپنے طور پر دے دیں۔ یہی اموال باطنہ تھے کہ جن کی زکوٰۃ لوگ لے کر پھرتے تھے لیکن کوئی قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا۔

نظام زکوٰۃ کا ایک اور امتیاز

یہاں میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اسکینڈے نیوین ممالک کا سوشلزم یا ویلفیئر کا نظام زیادہ نہیں چل سکتا۔ میں نے کئی سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ ویلفیئر کی اتنی بلند سطح برقرار رکھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں وہ طبقہ پیدا ہو جائے گا اور بڑھتا چلا جائے گا جو کام کئے بغیر اس ویلفیئر نظام ہی سے استفادے کو کافی سمجھ لے گا، اور حکومت کے اس نظام سے استفادے کو اپنا حق سمجھنے کی وجہ سے کسی بھی الاؤنس کی وصولی میں اسے اپنی خودداری بھی مجروح ہوتی ہوئی محسوس نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں اب ایسے لوگ بکثرت ہو گئے ہیں جن کو حکومت روزگار دلاتی ہے، لیکن وہ جلد از جلد بے روزگار ہو کر بے روزگاری الاؤنس وصول کرنے لگتے ہیں۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ اغنیاء پر زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے، لیکن زکوٰۃ لینے والوں سے کہا ہے کہ یہ تمہاری غیرت کی نفی ہے کہ تم لینے والے بنو اور زکوٰۃ قبول کرو۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور کسی کا محتاج نہ رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے کمانے کی ترغیب دلائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ''الکاسب حبیب اللہ'' (روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہے)۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی ہاتھ کی کمائی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے، زرہیں بناتے تھے، خزانہ کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ ''اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے۔'' آپؐ نے زکوٰۃ کو میل کچیل قرار دیا ہے اور خود اپنے آپ پر اور اپنی اولاد کو زکوٰۃ کی وصولی سے مستثنیٰ کر لیا ہے۔[۵]

اسلام کا معاشرتی نظام

آج کے خطبہ خلافت کے دوسرے حصے کا تعلق نظام خلافت کے تحت معاشرتی نظام کے اصول و مبادی سے ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام کے حوالے سے ایک بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس نظام سے کسی نہ کسی درجے میں واقف ہے۔ مثلاً ہر مسلمان پردہ اور ستر کے لازم ہونے کا علم رکھتا ہے، خواہ عمل کرنے میں کوئی کتنی ہی کوتاہی کرتا ہو۔ جب کہ نظام خلافت کے تحت معاشی اور سیاسی نظام کے بارے میں اوّل تو عام مسلمان بہت کم جانتے ہیں۔ پھر جدید تقاضوں کے تحت ان دونوں میں اجتہاد کی شدید ضرورت بھی ہے۔ گویا ان شعبوں کے بارے میں جتنا کچھ علم ہے بھی وہ فرسودہ ہو چکا ہے اور ان احکام و معاملات میں اجتہاد کی روشنی میں نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

ان خطبات کے آغاز ہی میں یہ بات عرض کر دی گئی تھی کہ اجتماعی نظام کی پہلی منزل عائلی نظام ہے۔ اس پہلی منزل کو امام الہند شاہ ولی اللہؒ ''تدبیر منزل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلی منزل کے بعد بہت سے دوسرے عوامل شامل ہو کر معاشرت کو وجود بخشتے ہیں۔ پھر جب ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے تب اقتصادی و سیاسی مسائل جنم لیتے ہیں، اور انہی مسائل کی کوکھ سے سیاسی و اقتصادی نظام وجود میں آتا ہے۔

معاشرتی نظام کے اصول ومبادی

اسلام کے معاشرتی نظام کے حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ گویا کامل انسانی مساوات موجود ہے۔ پیدائشی طور پر نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا، نہ نسل کی بنیاد پر، نہ رنگ کی بنیاد پر اور نہ جنس کی بنیاد پر۔ اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ عورت کو مرد سے گھٹیا تصور کیا جائے۔ قرآن حکیم اونچ نیچ کے اس قسم کے ہر تصور کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ (آل عمران ۱۹۵) یعنی تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔ ایک ہی باپ کے نطفے میں سے اس کا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی اور ایک ہی ماں کے رحم میں دونوں نے پرورش پائی ہے۔

یہ بات کہنے میں جتنی سادہ ہے دل وجان کے ساتھ اسے تسلیم کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ ہمارے ہاں ہندوؤں کو تو خوب برا بھلا کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں برہمن اور شودر کی معاشرتی تفریق موجود ہے لیکن بالکل اسی طرح ہمارے ہاں مصلی اور سید (سندھ میں امتی اور سید) کی تفریق موجود ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خود اسلام اس تقسیم کو کسی درجے میں بھی قبول نہیں کرتا۔ اسلامی کا پہلا اصل الاصول سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات ہے۔ اسلام کے تصور میں اگر مراتب کا کوئی فرق ہے تو وہ علم اور تقویٰ کے حوالے سے ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳)

''اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تقویٰ (خداترسی) میں سب سے زیادہ ہو۔''

علم اور تقویٰ وہ چیزیں ہیں جن کو آپ اپنی محنت سے کسب کرتے ہیں۔ ان کے برعکس وہ چیزیں جو آپ کو اپنے کسب کے بغیر عطا کی گئی ہیں، آپ کی پسند وناپسند اور کسب ومحنت کو ان کے حصول میں کوئی دخل نہیں ہے، ان کو وجہ اعزاز واکرام نہیں بنایا گیا۔ اللہ نے آپ کو جو رنگ اور شکل وصورت عطا کی ہے، اسی طرح آپ کو جس نسل میں پیدا کر دیا گیا ہے اور آپ کی جو جنس بنادی گئی ہے، ان چیزوں میں آپ کو کوئی اختیار قطعاً نہیں دیا گیا، لہٰذا جن چیزوں میں آپ کا اختیار نہیں ہے ان کی وجہ سے کوئی اونچ نیچ کا معیار قائم نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳)

''اے لوگو! بیشک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور قبیلوں کی صورت میں بنادیا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا ہے، جو تم سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہو۔''

البتہ دستوری اور قانونی سطح پر مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق ہوگا۔ یہ فرق بھی محض انتظامی ضرورت کے تحت ہے۔ اس لیے کہ ہم کو ایک نظام چلانا ہے، اور نظام وہی چلاسکتا ہے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس لیے نظام خلافت چلانے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی ہے۔ غیر مسلم اس نظام کو نہ چلا سکتے ہیں اور نہ چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن اس فرق کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہاں بھی معاملہ افضلیت یا مفضولیت کا نہیں ہے۔ کسی کو کبھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے کافر سے افضل ہوں (ایمان کی فضیلت اپنی جگہ مگر آدم کی اولاد ہونے میں یا انسان ہونے کے ناطے کافر اور مسلم دونوں ایک ہی سطح پر ہیں)۔ علاوہ ازیں مسلمان کو کافر سے جوہری طور پر افضل نہ قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اصل اعتبار خاتمے کا ہے، اور کس کا خاتمہ کس حالت پر ہوگا اس کا کسی کو علم نہیں۔ میں الحمدللہ آج مسلمان ہوں مگر اس بات کا امکان تو موجود رہتا ہے کہ کل کو میرا پاؤں پھسل جائے اور میں گمراہی کے غار میں جاگروں، اور اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کافر کے لیے ہدایت کا دروازہ کھول دیں۔ کفر واسلام کی یہ تقسیم مستقل نہیں ہے، جبکہ کالے اور گورے کی تقسیم تو مستقل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی کالا گورا ہوجائے لیکن کوئی کافر کلمہ پڑھ کر اس فرق کو ایک لمحے میں ختم کرسکتا ہے۔

ایک اور تقسیم انتظامی اعتبار سے ہے۔ یہ تقسیم افسر اور ماتحت کی ہے، اس تقسیم اور فرق کو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا۔ اسی طرح شرف انسانیت کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ روحانی اور اخلاقی بلندی کے لیے میدان دونوں کے لیے کھلا ہے۔ چنانچہ سورۂ احزاب کی آیت ۳۵ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝﴾

''بیشک مسلم مرد اور مسلم عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرمان بردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، (ادب سے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور روزہ دار عورتیں، روزہ دار مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں اور اللہ کو بہت سا یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا اہتمام کر رکھا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں جتنے بھی اوصاف عالیہ گنوائے گئے ہیں ان میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے، چنانچہ نہ جانے کتنے کروڑوں مرد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مقام پر رشک کرتے رہوں گے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ شرف انسانیت کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں، لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے تو اب (انتظامی طور پر) برابر نہیں رہے۔ اس لیے کہ اب ایک ادارہ وجود میں آ گیا ہے۔ یہ خاندان کا ادارہ (Institution of Family) ہے اور ہر ادارے کے لیے ایک سربراہ ہونا لازم ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی ادارے میں برابر کے درجے والے دو سربراہ ہوں تو اس کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم کی ہدایت یہ ہے کہ:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ﴾

(النساء:۳۴)

”مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس فضیلت کی بناء پر جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے اموال (خاندان کے ادارے کو قائم کرنے پر) صرف کئے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔“

یہ دراصل خاندانی ادارے کا نظم ہے اور اسی پر ہمارا سارا فقہی نظام قائم ہے۔ خاندان کے ادارے کا سربراہ مرد ہے۔ وہ شادی کے لیے مہر ادا کرنے کا پابند ہے، حالانکہ جس طرح شادی مرد کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کی بھی ہے۔ مرد عورت کے بغیر نامکمل ہے اور عورت مرد کے بغیر، اس کے باوجود مہر ادا کرنے کی پابندی مرد کے لیے ہے، عورت کے لیے نہیں۔ مرد کے ذمہ کفالت بھی ہے، وہ بیوی کے نان نفقے کا ذمہ دار ہے۔ بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی مرد ہی پر ہے۔ اسی مصلحت سے وراثت میں مرد کا حصہ عورت سے دوگنا رکھا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں باہم منطقی طور پر مربوط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات نے کسی گوشے میں کوئی جھول نہیں چھوڑا ہے۔

اسلام کے عائلی نظام کے حوالے سے علامہ اقبال نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے۔ علامہ اقبال اپنے چھٹے لیکچر میں کہتے ہیں کہ لوگ اسلام کے عائلی قوانین پر بڑے سطحی انداز میں غور کرتے ہیں اور اس وجہ سے وہ بہت سے اعتراضات شروع کر دیتے ہیں، گہرائی میں اتر کر غور نہیں کرتے۔ اسلام نے جو بات کہی ہے وہ اجمال سے کہی ہے، لیکن اسی اجمال کو ذرا کھول کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا ہر حکم یا ہدایت انتہائی معقول ہے۔ اسلام کے عائلی قوانین میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے عورت کو نہیں دیا گیا۔ تاہم عورت خلع حاصل کر سکتی ہے طلاق نہیں دے سکتی، الا یہ کہ شادی کے موقع پر عورت نے بطور شرط حق طلاق منوا لیا ہو۔ یہ تمام احکام خاندان کے نظام کو مستحکم رکھنے کے لیے مرد کی قوامیت کی ضرورت کا اظہار ہیں۔

اسلام کے خاندانی نظام میں والدین کے حقوق اس نظام کا دوسرا رخ یا بعد ثانی (second dimension) ہے۔ ایک مرد اور عورت سے خاندان کی ابتداء ہوتی ہے۔ پھر اولاد ہو جانے سے (Second Dimension) شروع ہو جاتی ہے۔ اب والدین اور اولاد کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ پھر اولاد جب ایک سے زائد ہو جاتی ہے تو اخوت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ایک خاندان کے ابعاد ثلاثہ (hree dimensions) ہیں۔

اس ادارے کا استحکام مرد اور عورت کے درمیان قوی رشتہ پر منحصر ہے۔ اسی طرح جتنا اولاد اور والدین کے درمیان رشتہ مضبوط ہوگا اتنا ہی خاندان کا ادارہ مستحکم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر اللہ کے حق کے ساتھ والدین کے حقوق کا ذکر ہے، آپ حیران ہوں گے کہ ان مقامات پر رسول کا ذکر بھی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں آتا ہے کہ ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ﴾ (لقمان:۱۴) یعنی ”شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا۔“ یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں آیا ہے کہ ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۳) یعنی ”تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔“ یہ سب اس لیے ہے کہ اولاد اور والدین کا رشتہ مضبوط ہو اور والدین پورے اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو اپنی اولاد میں پوری طرح کھپا دیں۔ وہ اپنے بڑھاپے کے لیے اس فکر کے ساتھ کچھ بچا کر نہ رکھیں کہ اس وقت کہاں سے کھائیں گے۔ انہیں اطمینان ہو کہ ان کی اولاد انہیں ان کا بدلہ دے گی۔ سورۂ بنی اسرائیل ہی میں آتا ہے کہ ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۴) یعنی ”اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جیسے انہوں نے (رحم کے ساتھ) مجھے پالا پوسا جب میں چھوٹا تھا۔“ اسی سورت میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے:

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○﴾ (۲۳،۲۴)

اس آیۂ مبارکہ کو پڑھیے اور یورپ میں جا کر دیکھ لیجئے کہ بوڑھے والدین کا کیا حشر ہوتا ہے، آپ ان کی حسرت اور محرومی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ بیچارے سالہا سال اپنی اولاد کو دیکھنے کے انتظار میں گزار دیتے ہیں۔ وہ کرسمس کا انتظار محض اس خوشی میں کر رہے ہوتے ہیں کہ اس موقع پر بیٹے یا بیٹی کی شکل نظر آئے گی۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اب اس موقع پر بھی ان کو اپنے پیاروں کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان کے ہاں Old Home میں تمام سہولتیں موجود ہیں۔ وہاں ٹی وی سیٹ لگے ہوئے ہیں۔ بہترین کھانا میسر ہے، لیکن اہل

یورپ یہ بات بھول گئے کہ انسانی جذبات کسی اور چیز کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔

خاندان کے ادارے کے استحکام کے لیے ایک تیسرا عنصر ستر وحجاب کے احکام ہیں۔اس اہم عنصر کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ زنا کے سد باب کے لیے عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط نہیں ہونا چاہئے۔اس کا اہم ترین تعلق جو خاندان کی مضبوطی کے ساتھ ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔[۶] اب غور کریں جس معاشرے میں بے پردگی اور عریانی ہے، آزادانہ اختلاط ہے اس معاشرے میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو دیکھتا ہے اور وہ اس کی نگاہوں میں ''کھب'' جاتی ہے، تو اب اس کے خیالوں میں تو وہی بسی ہوئی ہوگی۔ظاہر بات ہے کہ اس کا نتیجہ یہی نکلنا ہے کہ بیوی پر سے توجہ ہٹ جائے گی۔اس سے شوہر اور بیوی کے درمیان جو رشتہ الفت ومحبت موجود رہنا چاہیے وہ کمزور ہوگا اور اس کے کمزور ہونے سے خاندان کا ادارہ عدم استحکام کا شکار ہو کر رہے گا۔اس لیے اسلام نے عورت کے لیے پردے کو لازم کیا ہے، تاکہ شوہر کی پوری توجہ بیوی پر اور بیوی کی شوہر پر مرتکز رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی خواہش انسان کے اندر بہت ہی طاقتور محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو کہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے ان کی یہ بہت بڑی علمی خیانت ہے کہ وہ ایک طرف تو فرائڈ کو جدید نفسیات کا ''امام'' مانتے ہیں، جس کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے اندر سب سے طاقتور جذبہ محرک شہوت ہے۔مگر یہ مغرب زدہ لوگ صریحاً علمی خیانت کرتے ہوئے اس جذبہ کو محض مولویوں کا خاصہ ظاہر کر کے ان کو بدنام کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ مولویوں کو جنسیات کے سوا اور کوئی بات آتی ہی نہیں۔ جب کہ قرآن حکیم میں فطرت انسانی کے پیش نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ازواج مطہراتؓ تک کے بارے میں احکام دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امہات المؤمنین ہیں، لیکن اس کے باوجود پردے کے پیچھے سے مانگنے کا حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ:

﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ﴾ (الاحزاب:۵۳)

''یہ (عمل) پاکیزہ تر ہے تمہارے دلوں کے لیے بھی اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔''

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کی توجہ منتشر نہیں ہے تو اس سے باہمی اعتماد میں اضافہ ہوگا اور یہ باہمی مودت والفت خاندان کے ادارے کی پختگی پر منتج ہوگی۔میاں بیوی کے اعتماد کے اس ماحول میں جو اولاد پروان چڑھتی ہے وہ نہایت صحت مند نفسیات کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو شوہر کا بیوی سے اعتماد اٹھ جائے اور بیوی کا شوہر پر سے تو آپ اندازہ لگائیں کہ اس ماحول میں جو اولاد پروان چڑھے گی اس کے اندر منفی رجحانات کے سوا کیا ہوگا۔اس بے اعتمادی کے ماحول میں بچوں کے اندر مثبت اوصاف کہاں سے پیدا ہوں گے۔

اسلام نے عورت کے لیے یقیناً ستر وحجاب کے احکام دیئے ہیں۔مگر ان احکام کی پابندی کے باوجود عورت کو بہت زیادہ آزادی حاصل ہے۔عورت کاروبار کر سکتی ہے اور اپنی جائیداد رکھ سکتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ معاشرت مخلوط نہ ہو۔ہاں اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ﴾(الاحزاب:۳۳) (تمہاری اصلی توجہ تمہارے گھروں پر ہونی چاہئے) یہ گھر تمہارا اصل دائرہ کار ہے، اگرچہ یہ کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔لہٰذا ہمارے معاشرے میں زنانہ اور مردانہ کالج علیحدہ علیحدہ موجود ہیں اور جب ہم یونیورسٹی کے علیحدہ قیام کی بات کرتے ہیں تو مغرب زدہ طبقہ کی حلق میں یہ مطالبہ نہ جانے کیوں ہڈی بن کر پھنس جاتا ہے۔اسی طرح سے زنانہ اور مردانہ ہسپتال بھی علیحدہ علیحدہ بنائے جا سکتے ہیں، جو ہسپتال زنانہ ہوں وہاں مریض خواتین ہی کو داخلہ ملے اور ڈاکٹر بھی خواتین میں سے ہوں۔زنانہ ہسپتالوں میں نرسیں بھی عورتوں میں سے ہونی چاہئیں، جبکہ مردانہ ہسپتال میں مرد نرسوں کا اہتمام ہونا چاہئے۔ان ہسپتالوں میں زنانہ نرسیں بہت سے فساد کی جڑ ہیں۔سوچنے کی بات ہے کیا مرد نرسنگ نہیں کر سکتے؟ جبکہ فوج میں Forward Medical Units ہوتے ہیں جو محاذ جنگ پر جاتے ہیں، وہاں کوئی خاتون نرس نہیں ہوتی۔حالانکہ وہاں نرسوں کی ضرورت بھی بہت شدید ہوتی ہے۔ وہاں تو آپ خواتین نرسوں کو نہیں لے جاتے جبکہ عام مردانہ ہسپتالوں میں خواتین کو بطور نرس رکھا جاتا ہے۔آپ سوچئے کیا پی آئی اے میں کھانے اور ناشتے کی ٹرے مرد نہیں پیش کر سکتا؟[۷]

خاندانی ادارے کے اندر مزید استحکام پیدا کرنے کے لیے ان قریبی رشتہ داروں کو ''محرم'' قرار دیا گیا ہے جو بالعموم ساتھ ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور جن سے خاندان کا ادارہ تشکیل پاتا ہے، اور محرم مردوں کے ساتھ نکاح کو حرام قرار دے دیا گیا ہے، تاکہ ان رشتوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کو ہمیشہ پاکیزہ نگاہ سے دیکھیں۔ بھائی اور بہن، ماں اور بیٹا، ساس، سسر اور داماد وغیرہ۔اگر ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جائے تو خاندان کے اندر استحکام کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں شریعت کے احکام، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایک دفعہ یہ طے کر لیں کہ ہمیں چلنا شریعت پر ہے، یہ طے کر لینے کے بعد میں دعوے سے کہتا ہوں کہ راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ سب کام ہوں گے لیکن علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کے تحت ہوں گے۔آگ اور پانی کا یہ جوڑ جو فساد کی جڑ ہے اسے بہر حال ختم کرنا ہوگا۔اس ضمن میں ایک بات کہی جا سکتی ہے، بلکہ اکثر کہی جاتی ہے کہ آج کی دنیا معاشی دنیا ہے۔اس معاشی دوڑ میں اگر آپ اپنی آبادی کے پچاس فیصد کو علیحدہ رکھیں گے تو دنیا کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ اس کا جواب میں دے چکا

ہوں کہ ایک دفعہ عزم کرلیا جائے تو راستے کھلتے چلے جائیں گے۔آپ گھریلو صنعتوں کا اہتمام کیجئے،عورتوں کو گھر پر کام دیجئے تا کہ انہیں نکلنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔اسی طرح پرائمری ایجوکیشن مکمل طور پر خواتین کے حوالے کردی جائے،مگر یہ معاملہ تیسری چوتھی جماعت تک ہی ہونا چاہئے اس سے آگے نہیں، یہ بچوں کی عمر کا وہ دور ہوتا ہے جس میں ان کو شفقت ومحبت کی ضرورت ہوتی ہے اوراللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر مامتا کا جذبہ رکھا ہے۔اس کے علاوہ ایسے صنعتی یونٹ بنائے جاسکتے ہیں، جہاں عورتیں ہی نگرانی کریں اور عورتیں ہی کام کریں۔اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ عورتوں کے اوقات کار مردوں کے مقابلے میں کم ہوں،تا کہ وہ ایک بیوی اور ماں کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے وقت نکال سکیں۔

میں اپنی بات کو اس نکتے پر ختم کرتا ہوں کہ اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام عہد حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ہمیں اس حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ہم اپنے دین پر عمل کرتے ہوئے دنیا کا نہ صرف مقابلہ کریں گے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دکھائیں گے،لیکن آگے بڑھنے کے شوق میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہ چھوڑیں گے۔

حواشی

۱۔ سورۂ توبہ میں بعض منافقین کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ نفاق نے ان کے دلوں میں اس طرح جڑیں پھیلا دی ہیں کہ وہ اب نکل ہی نہیں سکتا جب تک کہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیے جائیں۔یہی صورت سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ربا کی ہے۔

۲۔ جوئے کے خاتمے کے سلسلہ میں حکمت قرآنی کا ایک عجیب رخ سامنے آتا ہے۔جوا، جو ایک خالص معاشی معاملہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو خمر (شراب) کے ساتھ بریکٹ کر کے دونوں کی حرمت و مذمت سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں ایک ساتھ بیان کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جوئے میں بھی آدمی محنت سے جی چراتا ہے اور شراب کا نشہ بھی زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کے لیے ہوتا ہے،جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

شراب اور جوئے میں مشابہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دونوں ہی بغض وعداوت پیدا کرنے کا موجب بھی ہیں۔

۳۔ ان کا پہلا تجدیدی کارنامہ نامزدگی کی بنیادی پر خلیفہ بننے سے انکار اور لوگوں کو اپنی اس بیعت سے آزاد کرنا تھا جو نام ظاہر کئے بغیر ایک دستاویز پر لی گئی تھی، جس میں بادشاہ نے اپنے بعد کے خلیفہ کا نام لکھ دیا تھا۔اس بیعت سے آزاد کرنے کے بعد جب لوگوں نے خود اپنی آزاد مرضی سے ان سے بیعت کی تب آپؒ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی۔

۴۔ اس موقعہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد پھر سے یاد کر لیجئے جو آپ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اقدام کے مواقع پر فرمایا تھا: ’’اگر یہ لوگ کہیں کہ اونٹ تو لے جاؤ مگر اونٹ باندھنے کی رسی نہیں دیں گے تب بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔‘‘ کہاں اونٹ کہاں اونٹ کی رسی مگر اصل بات یہ ہے کہ آپ دین میں ذراسی بھی ترمیم گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔انہوں نے فرمایا تھا: ’’کیا میرے جیتے جی دین میں کمی کی جائے گی؟‘‘

۵۔ ہمیں سیرت مبارکہ سے ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جب آپؐ نے مدد کے طالب کو کام کرنے کی ترغیب دی اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور ان سے معاش حاصل کرنے کا عملی راستہ بتایا۔

۶۔ میں نے یہی بات ایک انٹرویو میں انگریزی جریدے ہیرالڈ کو کہی تھی، میرا انٹرویو توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا۔بعد میں اسی انٹرویو کا حوالہ ایک امریکن عورت نے اپنی کتاب میں بھی دیا ہے اور مجھ پر خوب فقرے چست کئے ہیں۔میں نے جو اصل بات کہی تھی وہ ستر وحجاب کے احکام کے اثرات ہیں، جو خاندانی نظام کے استحکام پر مترتب ہوتے ہیں۔

۷۔ میں نے یہ بات صدر ضیاء الحق مرحوم سے بھی کہی تھی کہ یہ ائیر ہوسٹس جو ہفتوں کے لیے گھر سے باہر جاتی ہے، یہ شریعت کے کون سے قائدے کے مطابق جائز ہے، جبکہ مسلمان عورت حج اور عمرے کے لی بھی محرم کے بغیر نہیں جاسکتی؟ حالانکہ حج اور عمرہ کرنے والی خواتین بالعموم ادھیڑ یا عمر رسیدہ ہوتی ہیں،مگر پی آئی اے میں اس کے برعکس نوجوان بچیاں بیس بیس دن کے لیے ایک دوسرے ملک فلائٹ کے ساتھ جاتی ہیں۔غور کیجئے کہ یہ کون ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ’’بیٹیاں‘‘ ہیں!!۔